درس ۴

مطالعہ قرآن حکیم کا منتخب نصاب

خطِ عظیم

سورۂ حٰمٓ السجدہ کی آیات کی روشنی میں

ڈاکٹر اسرار احمد

مرکزی انجمن خدام القرآن لاہور

درس ۴

حظِّ عظیم

سورۂ حٰم السّجدہ کی آیات ۳۰ تا ۳۶ کی روشنی میں

نَحْمَدُهُ وَنُصَلِّي عَلٰى رَسُوْلِهِ الْكَرِيْمِ

أَمَّا بَعْدُ فَأَعُوذُ بِاللّٰهِ مِنَ الشَّيْطَانِ الرَّجِيْمِ ٥ بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ ٥

إِنَّ الَّذِينَ قَالُوا رَبُّنَا اللّٰهُ ثُمَّ اسْتَقَامُوا تَتَنَزَّلُ عَلَيْهِمُ الْمَلٰٓئِكَةُ أَلَّا تَخَافُوا وَلَا تَحْزَنُوا وَأَبْشِرُوا بِالْجَنَّةِ الَّتِي كُنْتُمْ تُوعَدُونَ ٥ نَحْنُ أَوْلِيٰٓؤُكُمْ فِي الْحَيٰوةِ الدُّنْيَا وَفِي الْاٰخِرَةِ، وَلَكُمْ فِيهَا مَا تَشْتَهِي أَنْفُسُكُمْ وَلَكُمْ فِيهَا مَا تَدَّعُونَ ٥ نُزُلًا مِّنْ غَفُورٍ رَّحِيمٍ ٥ وَمَنْ أَحْسَنُ قَوْلًا مِّمَّنْ دَعَا إِلَى اللّٰهِ وَعَمِلَ صَالِحًا وَّقَالَ إِنَّنِي مِنَ الْمُسْلِمِينَ ٥ وَلَا تَسْتَوِي الْحَسَنَةُ وَلَا السَّيِّئَةُ، ادْفَعْ بِالَّتِي هِيَ أَحْسَنُ فَإِذَا الَّذِي بَيْنَكَ وَبَيْنَهُ عَدَاوَةٌ كَأَنَّهُ وَلِيٌّ حَمِيمٌ ٥ وَمَا يُلَقَّاهَا إِلَّا الَّذِينَ صَبَرُوا، وَمَا يُلَقَّاهَا إِلَّا ذُو حَظٍّ عَظِيمٍ ٥ وَإِمَّا يَنْزَغَنَّكَ مِنَ الشَّيْطٰنِ نَزْغٌ فَاسْتَعِذْ بِاللّٰهِ، إِنَّهُ هُوَ السَّمِيعُ الْعَلِيمُ ٥

صَدَقَ اللّٰهُ الْعَظِيمُ! رَبِّ اشْرَحْ لِي صَدْرِي ٥ وَيَسِّرْ لِي أَمْرِي ٥ وَاحْلُلْ عُقْدَةً مِنْ لِسَانِي ٥ يَفْقَهُوا قَوْلِي ٥

"یقیناً وہ لوگ جنہوں نے کہا کہ ہمارا رب اللہ ہے پھر اس پر جم گئے' اترتے ہیں ان پر فرشتے (یہ کہتے ہوئے) کہ نہ غم کھاؤ اور نہ خوف' اور بشارت حاصل کرو اس جنت کی جس کا تم سے وعدہ کیا جاتا تھا۔ ہم تمہارے مددگار ہیں دنیا کی زندگی میں بھی اور آخرت میں بھی' اور تمہارے لئے وہاں وہ سب کچھ ہے جسے تمہارا جی چاہے اور تمہارے لئے وہاں وہ سب کچھ ہوگا جو تم طلب کرو گے۔ یہ مہمان نوازی ہوگی اس (اللہ) کی طرف سے جو بڑا بخشش فرمانے والا نہایت رحیم ہے۔ اور اس شخص سے بہتر بات کس کی ہو سکتی ہے جو اللہ کی طرف بلائے اور نیک عمل کرے اور کہے کہ میں بھی مسلمانوں ہی میں سے ہوں۔ اور (ہرگز) برابر نہیں ہے نیکی اور بدی' آپ (بدی کو) دفع کریں نہایت احسن طریقے سے' تو (اس کا نتیجہ یہ نکلے گا کہ) وہ شخص جس کے اور آپ کے مابین عداوت تھی آپ کا دلی دوست جیسا ہو جائے گا۔ اور یہ خوبی نہیں دی جاتی سوائے ان لوگوں کے جنہوں نے صبر کیا۔ اور یہ اچھائی نہیں دی جاتی مگر بڑے نصیب والوں کو۔ اور اگر (کبھی) شیطان کی جانب سے تمہیں کوئی وسوسہ ورغلائے تو فوراً اللہ کی پناہ میں آ جاؤ۔ یقیناً وہ سب کچھ سننے والا اور سب کچھ جاننے والا ہے"۔

مطالعۂ قرآن حکیم کے جس منتخب نصاب کا سلسلہ وار بیان ہدیۂ قارئین ہو رہا ہے اس کا پہلا حصہ قرآن حکیم کے چند ایسے مقامات پر مشتمل ہے جن میں انسان کی کامیابی اور نجات کی شرائط اور اس کی فوز و فلاح کے لوازم کا بیان نہایت جامعیت کے ساتھ ہوا۔ اس طرح ان مقامات کے مطالعے سے قرآن حکیم کے انسان مطلوب کی پوری سیرت و کردار کا ایک بھرپور اور مکمل نقشہ ابھر کر ہمارے سامنے آ جاتا ہے۔ چنانچہ اس مقام پر بھی جو اس حصے (جامع اسباق) کا آخری درس ہے' انسان کی تعمیرِ کردار اور اخروی نجات کے چار لازمی اوصاف کا بیان آیا ہے۔ یعنی ایمان کا ذکر بھی موجود ہے ایمان باللہ اور ایمان بالآخرت کی صورت میں۔ اور ایمان کے ساتھ ہی اعمال صالحہ کا بھی ذکر بھی کیا گیا ہے۔ یہاں "عمل صالح" ایک مرتبہ تو لفظ "استقامت" میں اور دوسری مرتبہ جوں کا توں "وَعَمِلَ صَالِحًا" کی شکل میں مذکور ہے۔ "تواصی بالحق" کے ذیل میں یہاں "دعوت الی اللہ" کی اصطلاح استعمال ہوئی ہے' اور آخر میں پھر "صبر" کا ذکر نہایت

اہتمام اور شدّ ومد کے ساتھ کیا گیا ہے۔ گویا وہی چاروں مضامین جو سورۃ العصر میں بیان کئے گئے ہیں پھر ذرا مختلف پیرائے میں "آیۂ بِر" میں ہمارے سامنے آجاتے ہیں۔ اس سے قدرے مختلف اسلوب کے ساتھ انہی چاروں مضامین کا بیان سورۂ لقمان کے دوسرے رکوع میں ہوا ہے۔ اور پھر یہی مضامین ان (زیر بحث) آیات میں بھی ایک نئی شان کے ساتھ ہمیں دعوتِ فکر دیتے ہوئے دکھائی دے رہے ہیں۔

اس مشابہت کے علاوہ ان چاروں مقامات میں ایک اور ربط بھی ہے اور وہ یہ کہ ان میں مضامین کا ایک تدریجی ارتقاء ہے۔ چنانچہ سورۃ العصر کو گویا BASELINE قرار دیا جا سکتا ہے۔ اس میں انسان کی کامیابی کے کم از کم لوازم کا بیان ہے' یعنی مجرد نجات' ناکامی سے بچنے کی کم سے کم شرائط۔ پھر اس سے آگے نسبتاً بلند تر مقام سے ہمیں آشنا کیا گیا اور وہ مقامِ بِر و تقویٰ ہے جو آیۂ بِر میں ہمارے سامنے آیا۔ اس سے بھی ایک نسبتاً بلند تر منزل جس کو ہم "مقامِ عزیمت" سے تعبیر کر سکتے ہیں' اس کا بیان سورۂ لقمان کے دوسرے رکوع میں آیا ہے۔ یعنی "اِنَّ ذٰلِكَ مِنْ عَزْمِ الْاُمُوْرِ" کی صورت میں۔ اور ان چاروں امور کے اعتبار سے واقعہ یہ ہے کہ بلند ترین منزلیں وہ ہیں جن کا ذکر ان آیات مبارکہ میں ہو رہا ہے۔ اس کے لئے عنوان اگر انہی آیات میں مستعمل الفاظ سے لیا جائے تو وہ "حَظِّ عظیم" ہو گا۔ یعنی بڑا نصیبہ' بہت ہی یاور بخت۔ اور اگر قرآن مجید کے ایک دوسرے مقام کے حوالے سے اس کا مرتبہ معین کیا جائے تو یہ درحقیقت مقامِ ولایت کا بیان ہے۔ یہی وجہ ہے کہ اس مقام پر ان چاروں چیزوں کی جو بلند ترین منازل ہیں ان کا ذکر ہوا۔ ایمان کی آخری منزل' اس کا لبِّ لباب اور اصل حاصل اللہ کی وحدانیت و ربوبیت پر دل کا جم جانا' ٹھک جانا اور اس پر پورا وثوق اور اعتماد قائم ہو جانا' پھر اس پر استقامتِ فکری' نظری اور عملی کا ہونا۔ اسی طریقے سے "تواصی بالحق" کا بلند ترین مقام اور اس کی بلند ترین منزل "دعوت الی اللہ" ہے۔ اللہ تعالیٰ جو اس کائنات کی سب سے بڑی حقیقت ہے اور جس ذات باری تعالیٰ کے سوا "الحق" کا مصداق کوئی نہیں (ذٰلِكَ بِاَنَّ اللّٰهَ هُوَ الْحَقُّ) لہٰذا اس کی طرف دعوت' اس کی طرف بلانا گویا "تواصی بالحق" کی بلند ترین منزل ہے۔ اسی طرح صبر کے ضمن میں یہاں اس مقام کا بیان

ہو رہا ہے جہاں صرف مخالفتوں کا برداشت کرلینا اور لوگوں کی طرف سے پیش آنے والی مصیبتوں کا جھیل جانا ہی کافی نہیں ہوتا بلکہ گالیوں کے جواب میں دعائیں دینا اور لوگوں کی طرف سے ایذا رسانی کے جواب میں ان کی خیر خواہی اور بہی خواہی کا اظہار کیا جانا' اور پروردگار سے ان کے لئے ہدایت کی دعائیں مانگنا مطلوب ہوتا ہے۔ یہ ہے صبر کی بلند ترین منزل۔ گویا کہ یہاں جن کیفیات اور صفات کا ذکر ہو رہا ہے انہیں ہر اعتبار سے انسانیت کی معراج قرار دیا جاسکتا ہے۔ ان صفات کا ایک مکمل نقشہ اور مصداقِ کامل تو یقیناً ہماری نگاہوں کے سامنے محمدؐ رسول اللہ ﷺ کی شخصیتِ مبارکہ ہے' لیکن آپؐ کے بعد اس نقشے میں فِٹ آنے والے درحقیقت وہ لوگ ہیں کہ جنہیں بالعموم اولیاء اللہ کے نام سے موسوم کیا جاتا ہے۔ یہ ہے ان مضامین کا اجمالی تذکرہ' جن کا تدریجی ارتقاء ہمارے منتخب نصاب کے حصہ اول میں ہو رہا ہے۔

اب آیئے اس کے ایک ایک جزو پر غور کرنے کی کوشش کریں۔

فرمایا : ﴿اِنَّ الَّذِیۡنَ قَالُوۡا رَبُّنَا اللّٰہُ﴾ "یقیناً وہ لوگ جنہوں نے کہا کہ ہمارا رب اللہ ہے" یعنی جو پہچان لیں کہ ہمارا مالک و آقا بھی اللہ ہے' ہمارا خالق و رازق بھی اللہ ہے' ہمارا مشکل کشا و حاجت روا بھی اللہ ہے۔ ﴿ثُمَّ اسۡتَقَامُوۡا﴾ "پھر اس پر وہ جم گئے"۔ واقعہ یہ ہے کہ اللہ کی معرفت اتنی مشکل نہیں ہے۔ اگر انسان کی فطرت مسخ نہ ہو گئی ہو اور عقل کسی غلط رخ پر نہ پڑ گئی ہو تو وہ عقل سلیم اور فطرت صحیحہ کے ذریعے اللہ تعالیٰ کی اجمالی معرفت تک پہنچ جاتا ہے۔ لیکن اللہ کو پہچاننے کے بعد اس کی ربوبیت اور الوہیت پر دل کا ٹھک جانا' یہ کوئی آسان کام نہیں ہے۔

استقامت کا مفہوم

استقامت یہ ہے کہ انسان کو بظاہر کتنا ہی خطیر نفع یا بھاری نقصان کسی کی طرف سے نظر آ رہا ہو لیکن وہ یہ یقین رکھے کہ میرا نافع اور ضار اللہ کے سوا کوئی نہیں' "لاحولَ ولا قوۃَ اِلّا باللّٰہ" اور "لا فاعلَ فی الحقیقۃِ وَلا مؤثّرَ اِلّا اللّٰہ"۔ تو یہ درحقیقت انسان کی کامیابی کی کڑی شرط بھی ہے اور معرفت الٰہی کی حقیقی اساس بھی۔

انسان اس عالم مادی میں عالم اسباب میں رہتے ہوئے اور بدلتے ہوئے حالات سے متأثر ہوئے بغیر چٹان کی مانند اپنے اس یقین پر جمارہے کہ اللہ ہی کی قدرت ہر شے پر حاوی ہے' اور وہی حقیقی مؤثر ہے۔ اس کے اذن کے بغیر ایک پتا تک جنبش نہیں کرتا' اور پھر اس پر انسان بالکل مطمئن ہو جائے اور اپنے معاملات اور اپنی ہر کوشش کو اللہ کے حوالے کر دے "وَاُفَوِّضُ اَمرِی اِلَی اللّٰہِ' اِنَّ اللّٰہَ بَصِیرٌ بِالعِبَادِ" اور یہ بات دل میں بٹھالے کہ میرے معاملات میرے اپنے ہاتھوں کی نسبت اس ذات کے ہاتھوں میں کہیں زیادہ محفوظ ہیں کہ جو "علیٰ کلِّ شیءٍ قدیر" ہے' جو "بکلِّ شیءٍ علیم" ہے' وہ میری مصلحتوں سے مجھ سے بڑھ کر واقف ہے' وہ میرا مجھ سے بڑھ کر خیر خواہ ہے' تو تب اسے تعلق بندگی میں رسوخ حاصل ہوتا ہے۔ اس کے ساتھ ساتھ وہ اپنی بے ثبات طبعی کیفیات کا محاسبہ بھی کرلے کہ میرا حال تو یہ ہے کہ میں ہر چیز سے فوراً تاثر قبول کرلیتا ہوں اور اپنی کم علمی کے باعث کوئی ایسی چیز پسند کر بیٹھتا ہوں جو حقیقت میں میرے لئے مضر ہوتی ہے اور کسی ایسی چیز کو برا سمجھ بیٹھتا ہوں جس میں میری حقیقی منفعت مضمر ہوتی ہے' اور اللہ ہی ہے جو ہر خیر کو جانتا ہے اور جو ہر شر سے واقف ہے۔ وہی ہے جسے قدرت حاصل ہے۔ انسان اللہ ہی کے "قدیر" ہونے پر یقین رکھے اور اپنے آپ کو اس کی بارگاہ میں یوں بے بس و عاجز تصور کرے جیسے صوفیاء کہتے ہیں کہ "کَالمَیِّتِ فِی اَیدِی الغَسَّالِ" یعنی انسان اللہ کی رضا پر اس طرح راضی رہے اور اس کی مرضی پر اپنے آپ کو اس طرح چھوڑ دے جیسے کہ میت (ایک مردہ جسم) ایک غسل دینے والے کے ہاتھ میں لاچار ہوتی ہے۔ یہ ہے انسان کا اللہ کے ساتھ صحیح ربط و تعلق' اور یہ ہے وہ استقامت جو مطلوب ہے' ورنہ مجرد کہہ دینا کہ "میرا رب اللہ ہے" اتنا مشکل نہیں جتنا کہ "ثُمَّ اسْتَقَامُوا" کے تقاضے پورے کرنا ہے۔ اور استقامت کے تقاضے یہ ہیں کہ عقیدہ میں' فکر میں' سوچ میں' نقطہ نظر میں اور بدلتے ہوئے حالات میں' انسان کا دل ہر اعتبار اللہ کی ربوبیت و قدرت مطلقہ پر جمارہے۔ یہ استقامت کا ایک پہلو ہے۔

استقامت کا دوسرا پہلو عملی ہے' وہ یہ ہے کہ انسان نے جس ذات کو مالک مان لیا ہے اس کے ہر ہر اشارے پر حرکت کرے' اس کی ہر مرضی کو پورا کرنے کے لئے ساری

قوت صرف کر دے۔ اس کا ہر حکم اس کے لئے واجب التعمیل ہو' اس کے اشارہ پر سب کچھ نچھاور کرنے پر بدل و جان آمادہ ہو۔ پھر انسان کی غیرت و حمیت کا تقاضا ہے کہ جو کچھ مالک کو پسند ہے اسے دنیا میں پھیلانے' رائج کرنے' غالب کرنے کے لئے تن من دھن کی بازی لگا دے' جو اسے پسند نہیں ہے بندہ بھی اسے ناپسند کرے اور ہمیشہ اس سے نبرد آزما بھی رہے اور اس کا نام و نشان مٹانے کے لئے جان اور مال نچھاور کر دے۔ یہ ہے استقامت عملی۔ گویا اگر یوں کہا جائے کہ سورۃ العصر' آیہ بر یا سورۂ لقمان کے دوسرے رکوع میں جتنے عملی پہلو ہمارے سامنے آئے ہیں وہ سب یہاں لفظ "استقامت" میں مضمر ہیں تو یہ بات بالکل بجا ہو گی۔ اسی لئے میں کہا کرتا ہوں کہ اس لفظ استقامت میں ایک قیامت مضمر ہے۔ نبی اکرم ﷺ سے جب ایک صحابی نے عرض کیا کہ حضور' مجھے کوئی ایسی بات تعلیم فرما دیجئے کہ جس کے بعد قول و عمل کی راہ میں کسی دشواری سے دوچار نہ ہوں اور بے دھڑک راہ ہدایت پر گامزن رہوں تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا: "قُلْ آمَنتُ بِاللّٰہِ ثُمَّ اسْتَقِم" یعنی "کہو میں ایمان لایا اللہ پر' پھر (عملاً) اس پر جمے رہو"۔

ایمان کا اعلیٰ ترین درجہ — مقام ولایت

حقیقت یہ ہے کہ یہاں ("اِنَّ الَّذِینَ قَالُوا رَبُّنَا اللّٰہُ ثُمَّ اسْتَقَامُوا" میں) جس بلند مرتبہ و مقام کا اور جن کیفیات کا ذکر ہو رہا ہے قرآن مجید کے دوسرے مقامات پر اسی کو مرتبہ "ولایت" سے تعبیر کیا گیا' اس لئے کہ اس آیت میں آگے جو نوید جانفزا "اَنْ لَّا تَخَافُوا وَلَا تَحْزَنُوا" دی جا رہی ہے قرآن مجید میں انہی الفاظ سے اولیاء اللہ کو خوشخبری سنائی گئی ہے۔ فرمایا: "اَلَا اِنَّ اَوْلِیَاءَ اللّٰہِ لَا خَوْفٌ عَلَیْہِمْ وَلَا ھُمْ یَحْزَنُونَ ○ الَّذِینَ اٰمَنُوا وَکَانُوا یَتَّقُونَ" یعنی حقیقی ایمان جنہیں میسر آ گیا ہو اور جو اللہ کے تقویٰ کو فی الواقع صحیح معنوں میں اپنی شخصیتوں میں جذب کر چکے ہوں' ان لوگوں کے لئے نہ کوئی خوف ہے اور نہ کوئی حزن۔ یہی در حقیقت ایمان کا ماحصل ہے۔ اس لئے کہ ایمان امن سے بنا ہے' اور امن کی ضد خوف بھی ہے اور غم بھی۔ گویا ایمان دے کر غم و حزن سے انسان کو بالکلیہ آزاد اور بے نیاز کر دیا گیا ہے۔

مقامِ ولایت کی عظمت کا ذکر کرنے کے بعد اللہ رب العزت نے ان کے علوّ شان کو پھر یوں بیان کیا کہ ﴿تَتَنَزَّلُ عَلَيْهِمُ الْمَلٰٓئِكَةُ﴾ یعنی ان پر ملائکہ کا نزول ہوتا ہے۔ "تَتَنَزَّلُ" عربی قواعد کی رو سے فعل مضارع کا صیغہ ہے اور عربی میں فعل مضارع حال اور مستقبل دونوں کا جامع ہوتا ہے۔ گویا اس کا یہ ترجمہ بھی درست ہوگا کہ "اترتے ہیں ان پر فرشتے" اور یہ بھی صحیح ہوگا کہ "اتریں گے ان پر فرشتے" اور واقعہ یہ ہے کہ یہ دونوں مفہوم یہاں جمع ہیں۔ ملائکہ کا نزول اس بشارت اور اس نوید جانفزا کے ساتھ ہوتا ہے کہ ﴿اَلَّا تَخَافُوْا وَلَا تَحْزَنُوْا﴾ "نہ خائف ہو نہ غمگین ہو"۔ خوف و غم سے اب تمہیں کوئی علاقہ نہیں ﴿وَاَبْشِرُوْا بِالْجَنَّةِ الَّتِيْ كُنْتُمْ تُوْعَدُوْنَ ۝﴾ "اور خوشخبری حاصل کرو اس جنت کی جس کا تم سے وعدہ کیا جاتا رہا"۔

نزولِ ملائکہ — کن مواقع پر؟

یہاں ایک مسئلہ مفسرین کے مابین زیر بحث رہا ہے کہ ملائکہ کے اس نزول کا وقت کونسا ہے۔ ملائکہ کے نزول کا ایک وقت تو وہ ہے جو سب کے نزدیک مُجمع علیہ ہے' وہ یہ کہ ملائکہ کا نزول بندۂ مومن پر' اللہ کے دوستوں پر' اللہ کے چاہنے والوں پر' ان کے انتقال سے متصلاً قبل ہوتا ہے جب کہ وہ اس عالم سے اس عالم کو منتقل ہونے کی تیاری کر رہے ہوتے ہیں۔ گویا اس عالم کے سفیر اس عالم میں ان کو خوش آمدید کہنے کے لئے اور ان کا استقبال کرنے کے لئے پہنچے ہوتے ہیں۔ یہ چیز بعض روایات سے بھی ثابت ہے اور اللہ کے نیک بندوں کے انتقال کے وقت کے بعض حالات جو متواتر سننے اور مشاہدے میں آتے رہے ہیں ان سے بھی ان کی تصدیق ہوتی ہے۔ اس اعتبار سے آیت کا مفہوم یہ ہوگا کہ اب تمہارے حزن اور خوف کا دور ختم ہوا' تمہارے رنج و محن کا دور گزر گیا۔ اس دنیا میں' جو تمہارا دار الامتحان تھا' تمہیں طرح طرح کی تکلیفیں اور طرح طرح کی آزمائشیں درپیش رہیں' قسم قسم کے مسائل سے سابقہ رہا' اب تم ان تمام الجھنوں سے چھوٹ گئے۔ لہٰذا اب خوشخبری حاصل کرو کہ اس کشمکش خیر و شر اور اس معرکۂ حق و باطل میں تم سرخرو اور کامیاب ہو کر عالمِ آخرت کی طرف کوچ کر رہے ہو۔ یہ مفہوم تو بالکل

واضح ہے اور متفق علیہ ہے۔

نزولِ ملائکہ کا دوسرا مفہوم جس کی طرف قرآن مجید کی بعض دیگر آیات سے رہنمائی ملتی ہے' یہ ہے کہ بندۂ مومن پر' اللہ کے دوستوں پر' اللہ کے چاہنے والے پر' حیاتِ دنیوی کے دوران بھی مسلسل ملائکہ کا نزول ہوتا ہے۔ اس کو یوں سمجھنا چاہئے کہ یہ دنیا درحقیقت دار الامتحان ہے۔ یہاں خیر و شر کی ایک کشمکش اور ایک چومکھی جنگ لڑی جا رہی ہے۔ اس چومکھی جنگ کا ایک میدان انسان کے باطن میں ہے جس میں شر کے محرکات بھی ہیں اور خیر کے داعیات بھی۔ شر کے محرکات میں وہ نفس امارہ بھی ہے جس کے بارے میں قرآن مجید خود کہہ رہا ہے "اِنَّ النَّفْسَ لَاَمَّارَۃٌۢ بِالسُّوْٓءِ" کہ یہ نفس امارہ برائی کی طرف راغب کرنے اور کھینچنے والا ہے۔ لیکن اسی باطنی میدان میں خیر کے محرکات اور قلب و روح کے داعیات بھی ہیں جو انسان کو بلندی اور عالم علوی کی طرف' خیر اور بھلائی کی طرف متوجہ کرنا چاہتے ہیں۔ یہ خیر و شر کی باطنی کشمکش ہے جس کا تجربہ ہر انسان کو ہے۔ گویا اس کی داخلی شخصیت کا ایک میدان کارزار ہے جس میں ہر وقت یہ جنگ جاری رہتی ہے۔

پھر یہی معرکہ خیر و شر خارج میں بھی برپا ہے۔ انسان کے خارجی ماحول میں بھی خیر کی قوتیں بھی موجود ہیں اور شر کی قوتیں بھی۔ انسانوں ہی میں وہ لوگ بھی ہیں جو خیر کی طرف بلانے والے ہیں۔ جیسے اولیاء اللہ ہیں' مبلغینِ حق ہیں' داعیانِ حق ہیں اور وہ کہ جنہیں نائبینِ رسول ﷺ کہا جائے' جو رسول ؑ کے منصب تبلیغ کو اپنا کر لوگوں کو خیر اور بھلائی کی دعوت دینے والے ہیں۔ اور انسانوں ہی میں وہ بھی ہیں کہ جو شر کے داعی ہیں اور برائی کی طرف پکارنے والے ہیں۔ یہ انسان شیاطین ہیں۔ پھر غیر مرئی مخلوقات میں بھی خیر و شر کے طبقات موجود ہیں جن میں سے ایک مخلوق وہ ہے جو شر کی طرف بلاتی ہے' جو انسان کی پیٹھ ٹھونکتی ہے۔ اگر وہ بدی کا راستہ اختیار کرتا ہے تو یہ بڑھ چڑھ کر اس کی مدد کرتی ہے۔ یہ جنات شیاطین ہیں جو ابلیس لعین کی صُلبی و معنوی معنوی ذریت ہیں۔ دوسری طرف غیر مرئی مخلوق ملائکہ ہیں۔ وہ نورانی وجود رکھنے والی ہستیاں ہیں۔ یہ خیر کی طرف بلانے والی اور اہل خیر کی ہمت افزائی کرنے والی ہیں اور ان کے لئے تثبیتِ قلبی کا ذریعہ بنتی

ہیں۔ چنانچہ میدان بدر میں اور معرکۂ اُحد میں ملائکہ کا نزول قرآن حکیم کی نصوصِ قطعیہ سے ثابت ہے۔ بعض احادیث میں بھی ملائکہ کے نزول کا بڑا صریح اور صاف نقشہ کھینچا گیا ہے۔ حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ حضور ﷺ ارشاد فرماتے ہیں :

((مَا اجْتَمَعَ قومٌ فِی بَیتٍ مِن بُیوتِ اللّٰہِ یتلون کتابَ اللّٰہِ وَیتدارَسونہٗ بینھم اِلَّا نَزَلَتْ علیھمُ السَّکینۃُ وحَفَّتھمُ الملائکۃُ وغشیتھمُ الرَّحمۃُ وَذکرھمُ اللّٰہُ فیمن عِندَہٗ)) (رواہ مسلم وابوداؤد والترمذی)

"کبھی ایسا نہیں ہوتا کہ کچھ لوگ اللہ کے گھروں میں سے کسی گھر میں اللہ کی کتاب کو پڑھنے اور باہم ایک دوسرے کو سمجھنے اور سمجھانے کے لئے جمع ہوں مگر یہ کہ ان پر اللہ کی سکینت کا نزول ہوتا ہے اور ملائکہ ان کے گرد گھیرا ڈال لیتے ہیں' اور رحمتِ خداوندی انہیں اپنے سائے میں لے لیتی ہے' اور اللہ تعالیٰ ملائکہ مقربین کی محفل میں ان کا ذکر کرتا ہے"۔

معلوم ہوا کہ ملائکہ کا یہ نزول صرف انتقال کے وقت ہی نہیں ہوتا بلکہ مومنینِ صادقین' اللہ کے دوستوں اور اس کے چاہنے والوں پر حیاتِ دنیوی کے دوران بھی مسلسل فرشتے اترتے ہیں۔ اس دوسرے مفہوم کی تائید یہ الفاظ قرآنی بھی کر رہے ہیں :

﴿ نَحْنُ اَوْلِیَاءُ کُمْ فِی الْحَیٰوۃِ الدُّنْیَا وَفِی الْاٰخِرَۃِ ﴾ یعنی "ہم ہیں تمہارے ساتھی (تمہارے رفیق' تمہارے حامی' تمہارے پشت پناہ) دنیا کی زندگی میں بھی اور آخرت کی زندگی میں بھی"۔ یہ قول اسی صورت میں زیادہ قابل فہم ہو گا جبکہ یہ حیاتِ دنیوی سے متعلق ہو' یعنی اس وقت جبکہ انسان فی الواقع اس کشمکش میں مبتلا ہو اور معرکۂ خیر و شر میں نبرد آزما ہو' اور ایسے کڑے وقت کوئی اس کی پیٹھ ٹھونکے اور اس کی ہمت افزائی کرے کہ ہم تمہارے ساتھی اور مددگار ہیں۔ تم اپنے آپ کو اس معرکے میں تنہا نہ سمجھو۔ "نَحْنُ اَوْلِیَاءُ کُمْ فِی الْحَیٰوۃِ الدُّنْیَا وَفِی الْاٰخِرَۃِ" تو اس دوسرے مفہوم کی تائید ان الفاظ مبارکہ سے زیادہ واضح ہو کر ہمارے سامنے آتی ہے۔ خلاصہ یہ ہے کہ یہاں بتایا گیا ہے کہ اگر اللہ کی ربوبیت پر انسان کو وثوق حاصل ہو جائے

اور اس پر اس کا دل جم جائے' تو یہ وہ مقام اور مرتبہ ہے کہ دورانِ حیاتِ دنیوی بھی ملائکہ کا نزول اس پر پیہم ہوتا رہتا ہے جس سے اسے انبساط حاصل ہوتا ہے' اس کے قلب کو تثبیت حاصل ہوتی ہے' اسے داخلی سکون اور اطمینان میسر آتا ہے اور اس کے قدموں میں جماؤ پیدا ہوتا ہے' جیسے کہ سورۂ انفال میں فرمایا : "اَنْ ثَبِّتُوا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا"۔ میدانِ بدر میں نازل ہونے والے فرشتوں کو اللہ کا حکم ہوا کہ "اہل ایمان کے قدموں کو جمادو" یعنی ان کے دلوں کے اندر ایک قوت پیدا کردو۔

آخرت میں اہل ایمان کے لئے اجر

رہا معاملہ آخرت کا تو اس کے متعلق ارشاد ہوتا ہے : ﴿وَلَكُمْ فِيهَا مَا تَشْتَهِيْۤ اَنْفُسُكُمْ﴾ یعنی "وہاں تو تمہارے لئے ہر وہ چیز (مہیا کردی گئی) ہے جس کی خواہش تمہارے جی کریں گے"۔ تمہارے نفوس کا خالق جانتا ہے کہ اس میں کس کس چیز کی اشتہا ہے' اس میں کس کس چیز کی طلب مضمر ہے' اور اللہ نے جو تمہارا خالق و مالک ہے' تمہارے نفس کے جملہ تقاضوں کی بھرپور تسکین کا اہتمام اس جنت میں کردیا ہے کہ جس کا تم سے وعدہ کیا جاتا رہا ہے۔ اس پر مزید فرمایا ﴿وَلَكُمْ فِيهَا مَا تَدَّعُوْنَ﴾ وہاں جو بھی مانگو گے' جو طلب کرو گے حاضر کردیا جائے گا۔

"اشتہا" اور "طلب" کے مابین ایک لطیف سا فرق ہے۔ اشتہا نفس انسانی کے وہ تقاضے ہیں جو تمام انسانوں میں مشترک ہیں' جنہیں مشتہیاتِ نفس کہا جاتا ہے۔ یعنی ان چیزوں کی خواہش نفس کے اندر موجود ہے۔ جنت میں ان تقاضوں کی بھرپور تسکین کردی جائے گی۔ اس لئے کہ اس دنیا میں بندۂ مومن اپنے نفس کی باگیں روک کر رکھتا ہے' اللہ کے حکم کے تحت نفس کی مرغوبات سے اپنے آپ کو دور اور خود کو تھامے رکھتا ہے "اَمَّا مَنْ خَافَ مَقَامَ رَبِّهٖ وَنَهَى النَّفْسَ عَنِ الْهَوٰى" تو اس کا ایک منطقی نتیجہ یہی نکلتا ہے کہ آخرت میں ان کے ان مشتہیاتِ نفسانیہ کو بھرپور تسکین فراہم کی جائے جس پر بندۂ مومن نے حیات دنیوی کے دوران قدغنیں بٹھائے رکھیں تھیں۔ اور "طلب" یہ ہے کہ ہر انسان کی ایک فکر اور شعور کی سطح (LEVEL OF CONSCIOUSNESS)

ہے۔ اس کے اعتبار سے ہر شخص کی تمنا مختلف ہوگی' ہر شخص کچھ اور چاہے گا۔ اس اعتبار سے اس جملے میں ایک امکانی کیفیت رکھ دی گئی کہ "وَلَكُمْ فِيهَا مَا تَدَّعُونَ" یعنی جو کچھ بھی تم چاہو گے اس کو پیش کر دیا جائے گا۔

جنت میں سب سے بڑی بات اللہ تعالیٰ کی میزبانی ہے جس پر اس ذکرِ عالی کو ختم فرمایا گیا۔ یعنی ﴿نُزُلًا مِّنْ غَفُورٍ رَّحِيمٍ﴾ "یہ اس ہستی کی طرف سے مہمان نوازی ہوگی جو غفور بھی ہے اور رحیم بھی"۔ اگر خطائیں ہیں تو وہ ان سے درگزر کرنے والا ہے' اگر کہیں کوئی قدم پھسل گیا تھا تو اس کو بخش دینے والا اور معاف فرمانے والا ہے' تاکہ اجر و ثواب میں کوئی کمی نہ رہ جائے۔ اس کی طرف سے مہمان نوازی ہوگی اور تم مہمان ہو گے۔ یہاں بخشش اور رحم فرمانے کے ذکر میں ایک لطیف اشارہ بھی ہے اور وہ یہ کہ سب کچھ جس کا ذکر کیا جا رہا ہے یہ درحقیقت "نُزُل" ہے' یعنی پہلی اور اولین مہمان نوازی۔ اہل عرب "نُزُل" کا لفظ اس مہمان نوازی کے لئے استعمال کرتے ہیں جو کسی مہمان کے آتے ہی فوراً پیش کی جائے۔ گویا "نَزِیل" (نزول کرنے والا) یعنی اترنے والا جیسے ہی اپنی سواری سے اترے' اس کے سامنے ٹھنڈا یا گرم فوراً پیش کر دیا جائے۔ یہ ہے نُزُل' اور اس کے بعد اہتمام ہوتا ہے ضیافت کا۔ تو یہ سب کچھ بھی نزل کے حکم میں ہے' اللہ تعالیٰ کی طرف سے جو ضیافت ہونے والی ہے اس کا تو کوئی تصور بھی اس دنیا میں ممکن نہیں۔ جیسے نبی اکرم ﷺ نے جنت کی نعمتوں کے بارے میں فرمایا کہ : ((مَا لَا عَيْنٌ رَأَتْ وَلَا أُذُنٌ سَمِعَتْ وَمَا خَطَرَ عَلٰى قَلْبِ بَشَرٍ)) "وہ ایسی نعمتیں ہیں کہ جو نہ کسی آنکھ نے کبھی دیکھیں' نہ کسی کان کبھی سنیں اور نہ ہی کبھی کسی انسان کے دل پر ان کا کوئی خیال یا احساس وارد ہوا"۔ وہ تو تمہارے حواس' تمہارے تخیلات سے ماوراء نعمتیں ہیں۔ باقی جو کچھ تمہارے احساس و ادراک میں آ سکتا ہے وہ نزل اور ابتدائی مہمان نوازی کے طور پر عطا کر دیا جائے گا۔ مطلب یہ کہ بخشش اور رحمت کے جام تسکین و فرحت تو مہمان کو آتے ہی پیش کر دیئے جائیں گے۔ پھر ضیافت کا وہ لامتناہی سلسلہ ہو گا جس کا کوئی حساب ہے نہ کوئی حد۔

"دعوت الی اللہ" کا فریضہ

سورۂ حٰم السجدہ کی زیرِ نظر آیات کو دو حصوں میں تقسیم کیا جا سکتا ہے۔ پہلے حصے میں تین آیات کا بیان ہوا' جن میں مرتبہ ولایت کا ذکر ہوا ہے۔ دوسرے حصے کی بقیہ چار آیات میں اسی تصویر کا دوسرا رخ سامنے آ رہا ہے جس میں اصل مرکزیت "دعوت الی اللہ" اور اس راہ میں پیش آنے والی مصیبتوں پر صبر اور اس کی اعلیٰ ترین منزل کے بیان کو حاصل ہے۔ چنانچہ فرمایا : ﴿وَمَنْ اَحْسَنُ قَوْلًا مِّمَّنْ دَعَآ اِلَى اللّٰهِ وَعَمِلَ صَالِحًا﴾ "اس شخص سے بہتر اور کس کی بات ہو گی جو اللہ کی طرف بلاتا ہو اور نیک عمل کرتا ہو"۔ یہاں یہ ذہن میں رہے کہ جہاں تک عمل کا تعلق ہے اس کا بھرپور ذکر پہلے حصہ میں استقامت کے ضمن میں ہو چکا ہے۔ یہاں درحقیقت عمل صالح کا ذکر اسی دعوت کی ایک ضرورت' اس کی تائید اور اس کے موثر ہونے کے لازمی تقاضے کے طور پر ہو رہا ہے۔ یعنی دعوت الی اللہ کا عمل بالکل غیر مؤثر رہے گا بشرطیکہ اس گواہی کے طور پر داعی کی اپنی زندگی حسن اخلاق کا ایک نمونہ نہ بن جائے۔ اگر داعی اپنی دعوت کا ایک عملی نمونہ اپنی زندگی میں پیش نہ کرے تو درحقیقت اپنی دعوت کا اولین دشمن وہ خود ہو گا۔ یہاں ("وَمَنْ اَحْسَنُ قَوْلًا مِّمَّنْ دَعَآ اِلَى اللّٰهِ" میں) دراصل "دعوت الی اللہ" کو ایک فریضہ کے طور پر بیان کیا جا رہا ہے۔ اسے یوں سمجھئے کہ وہ لوگ جن کا ذکر ابتدائی آیات میں کیا گیا ان کے ہاں دنیوی ساز و سامان' جائیداد' مال متاع اور ظاہری چمک دمک کو پرِکاہ کے برابر حیثیت حاصل نہیں ہوتی۔ بلکہ ان کی زندگی میں ان کی بلند ترین خواہش اور تمنا صرف یہ ہوتی ہے کہ وہ زیادہ سے زیادہ بندگانِ خدا کو خدا کے ساتھ جوڑ دیں' غافلوں کو اللہ کی جناب میں لا کر جھکا دیں اور بھولے بھٹکے ہوؤں کو سیدھے راستے پر لے آئیں۔ ان کی ساری عملی جدوجہد ایک ہی نقطے پر مرتکز ہوتی ہے کہ وہ اپنا سب کچھ خلقِ خدا کی ہدایت اور خلق کو خدا کی طرف بلانے میں صرف کر دیتے ہیں۔

"وَمَنْ اَحْسَنُ قَوْلًا مِّمَّنْ دَعَآ اِلَى اللّٰهِ" میں نطق انسانی کے مفید استعمال کی طرف بھی بلیغ اشارہ فرمایا جا رہا ہے۔ وہ یہ ہے کہ زبان ہر انسان کے پاس ہے' اس کا

استعمال ہر شخص کرتا ہے۔ جو لوگ نسبتاً باصلاحیت ہوتے ہیں وہ کسی نہ کسی دعوت کے علمبردار بن کر کھڑے ہو جاتے ہیں۔ کوئی کنبے اور قبیلے کی فلاح کا نعرہ لے کر اٹھتا ہے' کوئی قوم اور وطن کی عظمت کا نام لے کر اٹھتا ہے' کوئی عوام کے حقوق کا نعرہ لگاتا ہے' کوئی معاشی عدل اور معاشی انصاف کے لئے جدّوجہد کرنے کا دم بھرتا ہے۔ کہیں وطن کی عظمت پر گردنیں کٹائی جاتی ہیں' کہیں اپنی قومی برتری کے لئے محنتیں اور مشقتیں کی جاتی ہیں اور ایثار و قربانی کا داعیہ پیدا کیا جاتا ہے۔ اس طرح نامعلوم کتنی دعوتیں دنیا میں دی جاتی ہیں۔ لیکن سب سے اچھی بات اور بہترین دعوت اس شخص کی ہو گی جو اللہ کی طرف بلا رہا ہو۔ اس اللہ کی طرف جو سب کا خالق و مالک ہے' جو سب کا رازق ہے' جو سب کا آقا ہے' جو سب کا حاکم ہے' جس کے حضور میں سب کو چار و ناچار حاضر ہونا ہے' جس کے ہاتھ اور قبضہ قدرت میں کُل کائنات ہے' جس کے اذن کے بغیر ایک پتا تک جنبش نہیں کرتا اور جو اصل "الحق" ہے (ذٰلِكَ بِاَنَّ اللّٰهَ هُوَالْحَقُّ) اس کی طرف دعوت تواصی بالحق کی بلند ترین منزل ہے۔ یہ تمام دعوتوں سے بلند ترین دعوت ہے۔ بلاشبہ اس سے کم تر' نچلی سطح پر اصلاحی دعوت (REFORMATION MOVEMENT) اور محدود پیمانے پر خلق خدا کی خدمت کے کاموں کی بھی اپنی اپنی جگہ پر اہمیت و افادیت ضرور ہے' مگر دعوت الی اللہ ان سب سے بلند تر' اور اعلیٰ ترین ہے۔

مقام دعوت کا پہلا تقاضا ۔ عمل صالح

"وَعَمِلَ صَالِحًا" یعنی "اور جو نیک اعمال کرے" اس دعوت کا اولین اور بنیادی تقاضا داعی کی اپنی زندگی کا صالحیت سے عبارت ہونا ہے تا کہ وہ پورے انشراحِ صدر کے ساتھ کہہ سکے کہ جس بات کی طرف میں دعوت دے رہا ہوں کہ لوگو اللہ کی بندگی اختیار کرو' اللہ کی اطاعت کرو' اللہ کو چاہو' اللہ سے شدید محبت کرو' اللہ ہی کو اپنا مطلوب و مقصود حقیقی سمجھو' اس دعوت کا مجسم پیکر میں خود ہوں۔ میں نے خود اللہ تعالیٰ کی بندگی کو عملاً اختیار کیا ہے۔ بالفاظ قرآنی : "اَنَا اَوَّلُ الْمُسْلِمِيْنَ" اور "اَنَا اَوَّلُ الْمُؤْمِنِيْنَ" اور "قَالَ اِنِّىْ عَبْدُ اللّٰهِ" میں نے خود اللہ تعالیٰ کو اپنا محبوب بنا لیا

ہے اور میں تمہیں بھی دعوت دیتا ہوں کہ اسی کی محبت سے اپنے دلوں کو آباد کرو۔

دوسرا تقاضا — غرور اور تکبر سے اجتناب

﴿وَقَالَ اِنَّنِیْ مِنَ الْمُسْلِمِیْنَ﴾ "اور وہ کہے کہ میں بھی مسلمانوں ہی میں سے ہوں" یعنی ان کے ذاتی تقویٰ و تدین اور دین پر عمل پیرا ہونے کے باوجود اس میں کوئی غرور اور تکبر نہ ہو۔ وہ یہ نہ سمجھے کہ میں کوئی شئے دگر ہوں۔ وہ یہ کہے کہ میں کسی پہلو سے بھی تم سے جدا' علیحدہ' بلند تر اور اعلیٰ نہیں ہوں بلکہ میں بھی اللہ کے حضور گردن جھکانے والوں میں سے ہی ہوں۔ یہ درحقیقت ایک کلمۂ تواضع بھی ہے جو دعوت الی اللہ کی کامیابی کے لئے شرط لازم ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ انسان کی طبیعت ہی کچھ ایسی ہے کہ تکبر سے اسے نفرت ہے۔ چنانچہ جیسے ہی بجلی کا کرنٹ لگتا ہے تو انسان دھکا کھا کر پیچھے کی طرف گر جاتا ہے۔ اسی طرح جہاں کہیں بھی انسان کو خود پسندی' عجب' تکبر اور غرور کے آثار محسوس ہوں گے وہاں انسانوں میں بعد اور دوری ہوگی۔ لیکن جہاں کہیں تواضع اور انکساری ہوگی وہاں کشش ہوگی۔ یہی وجہ ہے کہ نبی اکرم ﷺ کو بھی حکم دیا گیا کہ "وَاخْفِضْ جَنَاحَكَ لِلْمُؤْمِنِیْنَ" یعنی "اہل ایمان کے لئے اپنے بازوؤں کو (اپنے شانوں کو) جھکا کر رکھئے"۔ مطلب یہ ہے کہ جب اہل ایمان آپؐ کے پاس آئیں تو یہ محسوس کریں کہ رسولِ رحمت ﷺ کے دل میں ان کے لئے محبت' شفقت' مودت اور رحمت موجود ہے۔ یہ دلوں کو موہ لینے والا انداز ہے۔ اور ظاہر بات ہے کہ اس میں تواضع کو بڑا دخل حاصل ہے۔ حدیث میں ہے کہ نبی اکرم ﷺ جب صحابہؓ کے مابین بیٹھے ہوتے تو آپؐ کی کوئی امتیازی نشست نہیں ہوتی تھی اور بسا اوقات آنے والوں کے لئے یہ طے کرنا مشکل ہوتا تھا کہ ان میں محمدؐ رسول اللہ ﷺ کون ہیں۔ اگر آپؐ کہیں تشریف لے جاتے اور صحابۂ کرام رضی اللہ عنہم تعظیماً کھڑے ہوتے تھے تو آپؐ اس سے بھی منع فرماتے۔ آپؐ کبھی بھی اپنے لئے کوئی نمایاں حیثیت اور نمایاں مقام کے خواہاں نہیں ہوئے۔ بعض لوگوں نے اس سے بڑا عمدہ نکتہ نکالا ہے کہ آنحضور ﷺ کو دنیا میں جو عظیم کامیابی حاصل ہوئی اس کا ایک بڑا واضح' محسوس اور عقل میں آنے والا سبب یہ ہے کہ

آپ ؐ کا "نزول" بہت کامل ہے۔ آپ ؐ نے خالص انسانی سطح پر زندگی بسر کی' انسانوں میں گھل مل کر' ان کے اندر مل جل کر رہنا پسند فرمایا۔ اپنے لئے کوئی ایسا مقام کہ جہاں سے اترنے کے لئے انسان آمادہ نہ ہو اور اس بلند مقام سے لوگوں کو بنظرِ استحقار دیکھ رہا ہو اور لوگوں تک رسائی میں تکلف ہو (نعوذ باللہ من ذلک) اس قسم کا کوئی نقشہ محمدِ عربی ﷺ کی شخصیتِ مطہرہ میں نظر نہیں آتا۔

تیسرا تقاضا — جداگانہ تشخص سے گریز

"اِنَّنِی مِنَ الْمُسْلِمِینَ" سے ایک اور رہنمائی ہمیں یہ ملتی ہے کہ ہمارا تشخص اور پہچان صرف "اسلام" ہی ہونا چاہئے لیکن ہمارا المیہ ہے کہ امت میں جو دعوت بھی اٹھی اس کے داعی نے ابتداء تفرقے کی مذمت کرتے ہوئے خالصتاً اسلام کی دعوت دی لیکن بعد میں دعوت قبول کرنے والوں نے ایک فرقے کی شکل اختیار کرلی اور مسلمانوں سے جدا ہو گئے۔ ان کا ایک علیحدہ تشخص قائم ہو گیا۔ گویا دعوتِ دین کے لئے اس بڑی احتیاط کو ملحوظ رکھنا نہایت ضروری ہے کہ جو شخص بھی اس راہ میں قدم بڑھائے' جو بھی دعوت الی اللہ کی ذمہ داری اور انبیاء و رسل کے اس حق امانت کو ادا کرنے کے لئے آگے آئے اس کے لئے لازم ہے کہ وہ اپنا کوئی جداگانہ تشخص قائم نہ کرے' مسلمانوں سے کٹ نہ جائے اور مسلمانوں سے کوئی علیحدہ حیثیت اختیار نہ کرے' بلکہ جہاں تک ہو سکے شعوری طور پر اس کی کوشش یہ ہونی چاہئے کہ وہ اپنے آپ کو پوری طرح مسلمانوں کے ساتھ identify کرے۔

"اِنَّنِی مِنَ الْمُسْلِمِینَ" میں ہمارے لئے یہ رہنمائی بھی موجود ہے کہ مختلف مسالک اور فرقوں کی طرف بلانا دعوت الی اللہ نہیں۔ دعوت الی اللہ صرف یہ ہے کہ اللہ کی بندگی' اس کی کامل اطاعت' اس سے انتہائی محبت اور اس کی معرفت سے اپنا وجود منور کرو' اپنے قلوب و اذہان میں اجالا کرو' اسی کی یاد سے دلوں کو راحت و سکون آشنا کرو۔ از روئے الفاظ قرآنی : "اَلَا بِذِكْرِ اللّٰهِ تَطْمَئِنُّ الْقُلُوْبُ"۔ وہی تمہارا مطلوب و مقصود بن جائے' اسی کی رضا جوئی تمہاری زندگی کا نصب العین ہو۔ تمہارا جینا

اور مرنا' تمہارا جاگنا اور سونا صرف اسی کے لئے ہو جائے' جیسے قرآن حکیم میں ایک اور مقام پر فرمایا : "اِنَّ صَلَاتِی وَنُسُکِی وَمَحْیَایَ وَمَمَاتِی لِلّٰہِ رَبِّ الْعٰلَمِیْنَ"۔ اس سے تمہارا وہ تعلق قائم ہو جائے کہ تم اگر کسی سے محبت کرو تو صرف اسی کے لئے' کسی سے نفرت رکھو تو اسی کے لئے۔ اسی کو دو جس کو دینے کا اس نے حکم دیا اور کسی سے روکو تو اس لئے کہ اس کو نہ دینا اللہ کو پسند ہے۔ یہ وہ بات ہے جو حضور ﷺ نے ارشاد فرمائی :

((مَنْ اَحَبَّ لِلّٰہِ وَاَبْغَضَ لِلّٰہِ وَاَعْطٰی لِلّٰہِ وَمَنَعَ لِلّٰہِ فَقَدِ اسْتَکْمَلَ الْاِیْمَانَ))

یعنی "جس نے اللہ کے لئے محبت کی اور اللہ کے لئے دشمنی رکھی اور اللہ کے لئے کسی کو دیا اور اللہ کے لئے روکا تو اس نے ایمان کی تکمیل کر لی"۔

داعی کی شخصیت - ایک نظر میں

اب آیئے اس آیت مبارکہ کو ایک وحدت کی حیثیت سے دیکھتے ہیں : ﴿وَمَنْ اَحْسَنُ قَوْلًا مِّمَّنْ دَعَا اِلَی اللّٰہِ وَعَمِلَ صَالِحًا وَّقَالَ اِنَّنِی مِنَ الْمُسْلِمِیْنَ٥﴾ اس سے بہتر بات اور کس کی ہو گی جو اللہ کی طرف بلاتا ہو' جس کی گواہی اس کا عمل دے رہا ہو' وہ خود اپنے عمل میں اللہ کا ایک مکمل بندہ نظر آ رہا ہو۔ اخلاق حسنہ کی ایک تصویر اس کے سراپا سے مترشح ہو' پھر وہ تواضع اور انکساری کے ساتھ خود اپنے آپ کو مسلمانوں ہی میں سے شمار کرا رہا ہو۔ اس کی دعوت کسی جداگانہ فرقے یا جداگانہ مسلک کی طرف نہ ہو بلکہ صرف اللہ کی طرف ہو۔ یہ ہے تواصی بالحق کی وہ بلند ترین منزل جس پر نبی اکرم ﷺ اور صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کے بعد اگر کچھ لوگ فائز نظر آتے ہیں تو وہ پاکیزہ انسان ہیں جنہیں اولیاء اللہ کے نام سے موسوم کیا جاتا ہے۔ وہ کبار صوفیاء جنہوں نے اپنے گھر بار تج دیئے۔ سوچئے کہ معین الدین اجمیری رحمتہ اللہ علیہ اجمیر میں کوئی تجارت یا کاروبار کرنے آئے تھے؟ ہرگز نہیں' بلکہ صرف اسی دعوت کی تڑپ انہیں اجمیر لائی تھی۔ اسی تڑپ کی بدولت کلمہ توحید کی صدائیں خود ان کے وجود کو

سرمست اور بے خود کئے ہوئے تھیں اور دوسری کوئی تمنا ان کے دل میں سرے سے باقی نہ رہی تھی' بقول مجذوب رحمہ اللہ ؎

ہر تمنا دل سے رخصت ہو گئی
اب تو آ جا اب تو خلوت ہو گئی

ایسے اولیاء اللہ نے اپنے دلوں میں صرف اللہ تعالیٰ کو بسایا تھا۔ صرف اللہ کی طرف لوگوں کو دعوت دینے کو انہوں نے اپنی کل سعی وجہد کا مطلوب و مقصود بنایا تھا۔ اسی کے لئے ان کا جینا تھا اور اسی کے لئے ان کا مرنا تھا۔ خلق خدا کی محبت اور ان پر رحمت و شفقت اور مودت ان کے پورے وجود میں سرایت کر چکی تھی۔ اس اعتبار سے ﴿وَمَنْ اَحْسَنُ قَوْلًا مِّمَّنْ دَعَا اِلَى اللّٰهِ وَعَمِلَ صَالِحًا وَّقَالَ اِنَّنِیْ مِنَ الْمُسْلِمِیْنَ ۝﴾ کے اس نقشے پر واقعتاً صرف اولیاء اللہ پورے اترتے نظر آتے ہیں۔

دعوت حق کی مخالفت — ایک ناگزیر امر

یہاں یہ بات واضح رہنی چاہئے' جیسے کہ اس سے پہلے کے تین اسباق میں ہم دیکھ چکے ہیں کہ حق کی دعوت خواہ کتنے ہی خلوص اور بے نفسی سے دی جائے اس کی مخالفت اور مزاحمت ضرور کی جائے گی' خواہ اس دعوت کے پیش کرنے والے ایسے لوگ ہی کیوں نہ ہوں جن کی نیتوں پر شک نہ کیا جا سکتا ہو۔ اس کا اس سے بڑھ کر اور ثبوت کیا ہو سکتا ہے کہ خود رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم جنہیں ان کے کٹر دشمن اور ان کے خون کے پیاسے بھی "الصادق" اور "الامین" کہتے تھے' جن کی شخصیت پر کوئی داغ نہ دکھا سکا اور جن کے کردار پر کوئی انگلی نہ اٹھا سکا' انہیں بھی شدید مخالفت بلکہ اس سے بڑھ کر مزاحمت کا سامنا کرنا پڑا۔ آپؐ کے قریب ترین اعزہ آپؐ کی جان کے درپے ہوئے۔ ابولہب جیسا قریبی رشتہ دار آپؐ کا دشمن بن گیا۔ اس کی بیوی نے آپؐ کے راستے میں کانٹے بچھائے۔ قریش کا پورا گھرانہ آپؐ کے اعزہ واقارب ہونے کے باوجود دشمن بنا۔

معلوم ہوا کہ یہ ممکن ہی نہیں ہے کہ کوئی دعوت واقعتاً حق کی ہو اور باطل اس کی

راہ میں مزاحم نہ ہو۔ باطل کبھی بھی اسے LYING DOWN نہیں لے گا۔ اس کے باطل ہونے کا تقاضا یہ ہے کہ وہ حق کا راستہ روکے، حق کے راستے میں موانع و مشکلات پیدا کرے۔ یہ دو اور دو چار کی طرح کا وہ اصول ہے جس سے کہیں کوئی استثناء نہیں۔ اگر محمد عربی صلی اللہ علیہ وسلم کے لئے استثناء نہ ہوا اور آپ ؐ کو اپنے جسم مبارک پر پتھراؤ جھیلنا پڑا، اپنے دندان مبارک شہید کرانے پڑے، اپنے لخت جگر اور انتہائی محبوب صحابہ کی جانوں کا ہدیہ بارگاہ ربانی میں پیش کرنا پڑا، حضرت مصعب بن عمیر ؓ جیسے جاں نثار اور حضرت حمزہ بن عبد المطلب جیسے محبوب چچا، خالہ زاد، دودھ شریک بھائی اور ساتھ کے کھیلے ہوئے ہجولی، کی لاشیں اگر نبی اکرم ﷺ کے سامنے اس حال میں آئی ہیں کہ ناک کٹی ہوئی ہے، کان کاٹ لئے گئے ہیں، پیٹ چاک اور کلیجے کو چبالیا گیا ہے تو کیسے ممکن ہے کہ کسی دوسرے کے لئے یہ اٹل قانون توڑا جا سکے لہٰذا مخالفت، مخاصمت، موانع اور مشکلات اور آزمائشیں اس راہ کے سنگ میل ہیں۔ مخاطبین، جنہیں حق کی دعوت دی جارہی ہو ان کی طرف سے استہزاء، تمسخر اور مخالفت بھی ہوگی اور ایذا رسانی بھی اور جان لینے کے درپے بھی ہوں گے اور گھر سے نکال باہر بھی کریں گے۔

مخالفت کی صورت میں داعی کے لئے ہدایات

اس تکلیف دہ کیفیت میں داعی الی اللہ کا مقام کیا ہوگا۔ اس کو ایک عجیب پُر حکمت قاعدہ کلیہ سے شروع کیا گیا جس سے داعی کی تربیت اور تالیف قلب کا انوکھا اور بڑا مؤثر اصول سامنے آتا ہے۔ فرمایا: ﴿وَلَا تَسْتَوِی الْحَسَنَةُ وَلَا السَّيِّئَةُ﴾ "(دیکھو) نیکی اور بدی برابر نہیں ہوتی" نیکی نیکی ہے اور بدی بدی ہے۔ نیکی کی اپنی تاثیر ہے اور بدی کی اپنی تاثیر۔ اب کیسے ممکن ہے کہ یہ دونوں برابر ہو جائیں۔ "لَا تَسْتَوِی الْحَسَنَةُ وَلَا السَّيِّئَةُ" میں مبالغے کا ایک انداز حرفِ نفی "لَا" کی تکرار سے بھی پیدا کیا گیا حالانکہ بات یوں بھی پوری ہو جاتی کہ "وَلَا تَسْتَوِی الْحَسَنَةُ وَالسَّيِّئَةُ" برابر نہیں ہیں نیکی اور بدی، لیکن "لا" کو مکرر لا کر تاکید کا رنگ پیدا کیا گیا۔ "وَلَا تَسْتَوِی الْحَسَنَةُ وَلَا السَّيِّئَةُ" سے نتیجہ یہ نکالا گیا ہے کہ نیکی کی

دعوت کی راہ میں بدی ضرور آڑے آئے گی اور رکاوٹ بنے گی' مگر اس کا علاج بڑا دلنشیں تجویز فرمایا: ﴿اِدْفَعْ بِالَّتِیْ هِیَ اَحْسَنُ﴾ مخالفتوں کا جواب بڑے ہی احسن اور عمدہ طریق سے دو۔ "اَحْسَنُ" اَفْعَلُ کے وزن پر تفضیل کا صیغہ ہے جس کے معنی ہیں سب سے زیادہ خوبصورت اور بہترین۔ یعنی نہایت اعلیٰ اور سب سے عمدہ طور سے مخالفتوں کی مدافعت کرو' اگر تمہیں گالیاں دی جائیں تو جواب میں تمہارے لبوں پر دعا آ جائے۔ پتھروں کی بوچھاڑ ہو رہی ہو تو تمہاری جانب سے پھولوں کا ہدیہ پیش ہو جائے۔ تمہارے قتل کے منصوبے بنائے جائیں تو تم شب کی تنہائی میں اپنے رب کے حضور مخالفین کی ہدایت کی دعائیں مانگو۔ یہ ہے بہترین مدافعت اور "اِدْفَعْ بِالَّتِیْ هِیَ اَحْسَنُ" کا اصل مفہوم۔

اس طور سے دفاع کا نتیجہ کیا نکلے گا؟ اس کا جواب دیا گیا ہے کہ ﴿فَاِذَا الَّذِیْ بَیْنَكَ وَبَیْنَهٗ عَدَاوَةٌ كَاَنَّهٗ وَلِیٌّ حَمِیْمٌ ۝﴾ "پھر وہ شخص جس کے اور تمہارے درمیان عداوت (اور دشمنی تھی) ایسے ہو جائے گا جیسے گرم جوش دوست"۔ یعنی وہ لوگ جو کل تک تمہارے خون کے پیاسے تھے' تمہارے حمایتی' مددگار اور جاں نثار بن جائیں گے۔ سیرت کے مطالعے سے معلوم ہوتا ہے کہ خالد بن ولید جن کی وجہ سے غزوۂ احد میں ستّر مسلمانوں نے جام شہادت نوش کیا' جنہوں نے مسلمانوں کے فتح مند ہونے کے بعد یہ دیکھ کر کہ وہ درہ جہاں محمد عربی ﷺ نے پچاس تیر اندازوں کو متعین کیا تھا خالی ہو گیا ہے' پورے کوہ احد کا چکر کاٹ کر حملہ کیا اور مسلمانوں کی فتح شکست میں تبدیل ہو گئی اور ستر صحابہ کے خون سے دامن احد کی زمین رنگین ہو گئی' پھر وہی خالد بن ولید ہیں جو مشرف بہ اسلام ہوئے اور "سَیْفٌ مِنْ سُیُوْفِ اللّٰهِ" کا لقب پایا اور محمدِ عربی ﷺ کے سچے جاں نثار بنے۔ اب جہاں حضور کا پسینہ گرے وہاں اپنا خون گرانے کو موجب سعادت سمجھنے لگے۔

یہ طرز عمل اور "دفاعِ اَحسن" صبر کی بلند ترین منزل ہے۔ اگرچہ صبر یہ بھی ہے کہ کوئی گالی دے اور انسان خاموش رہے۔ کوئی پتھر مارے اور انسان اس کو چپ چاپ جھیل لے لیکن یہ صبر کی ابتدائی منزل ہے۔ جبکہ یہاں جن مقاماتِ عالیہ اور جن بلند

مراتب صبر کا بیان ہوا ہے ان کے اعتبار سے صبر کی اعلیٰ ترین منزل بالکل مختلف اور جداگانہ ہے۔ وہ یہ ہے کہ گالیوں کے جواب میں دعائیں دی جائیں' پتھروں کے جواب میں لوگوں کو پھول پیش کئے جائیں اور جو لوگ تمہارے قتل کے منصوبے بنا رہے ہوں پروردگار کے حضور میں ان کی ہدایت کے لئے دعائیں کی جائیں۔

حقیقت یہ ہے کہ اس اعتبار سے بھی اگر دیکھا جائے تو نبی اکرم ﷺ اور صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کے بعد پوری تاریخِ امتِ مسلمہ میں صبر کے کڑے معیار پر بھی کوئی لوگ پورے اترتے دکھائی دیتے ہیں تو وہ وہی لوگ ہیں جن کا ذکر کیا جا چکا ہے۔ یعنی صوفیاءِ کبار اور اولیاء اللہ' جنہوں نے اپنے بدخواہوں کو دعائیں دیں' جن کے سینے انتہائی کشادہ تھے' جن کے دلوں میں لوگوں نے اپنے لئے شفقت و مودت اور محبت و رحمت کا دریا موجزن پایا۔ ان کی انہی کیفیات اور طرزِ عمل کا نتیجہ یہ نکلا ہے کہ بابا فرید رحمتہ اللہ علیہ کے ہاتھ پر نوے ہزار لوگ مشرف بہ اسلام ہوئے۔ اسی طرح حضرت معین الدین اجمیری رحمتہ اللہ علیہ کے ذریعے لاکھوں کی تعداد میں لوگوں نے اسلام قبول کیا۔ سرزمین ہند میں اسلام پھیلا ہے تو انہی لوگوں کے طفیل' ورنہ بادشاہوں اور ہمارے حکمرانوں کا جو طرزِ عمل رہا ہے وہ اسلام سے برگشتہ کرنے میں تو ممد ہو سکتا تھا اسلام کی طرف راغب کرنے میں نہیں "الا ماشاء اللہ"۔ چنانچہ چند شخصیتوں کے استثناء کے ساتھ پوری ہزار سالہ تاریخ میں عظیم اکثریت کا حال یہی رہا ہے کہ وہ لوگوں کو اسلام سے دور کرنے کا موجب تو بنے ہیں مگر اسلام کی طرف دعوت دینے میں اور اس کی طرف راغب کرنے میں ان کا کوئی حصہ نہیں۔ یہ سارا دعوت کا کام انہی لوگوں کے طفیل انجام پایا ہے جو نبی اکرم ﷺ کے نقشِ قدم پر چلے۔ انہوں نے کبھی دنیوی جاہ کی حرص نہیں کی' بلکہ ان کی زندگیوں میں ایک ہی آرزو رہ گئی تھی اور وہ یہ تھی کہ خلقِ خدا کی ہدایت کا سامان کیا جائے۔ گویا یہ لوگ نوعِ انسانی کے لئے مجسم خیر خواہی تھے۔

یہ رتبہ بلند ملا — جس کو مل گیا

اس کے بعد فرمایا : ﴿وَمَا یُلَقّٰـهَآ اِلَّا الَّذِیْنَ صَبَرُوْا﴾ "اس مقام تک

نہیں پہنچ پاتے مگر وہی لوگ جنہوں نے صبر کیا"۔ یعنی جن میں تحمل و برداشت اور صبر کا بڑا ظرف ہوتا ہے، جو جھیل سکتے ہیں، جو اپنے نفس کے اندر اٹھنے والے طوفان کو روک سکتے ہیں، اور جو فی الواقع صبر کے اعلیٰ مراتب پر فائز ہیں۔ ﴿وَمَا يُلَقّٰهَآ اِلَّا ذُوْ حَظٍّ عَظِيْمٍ ○﴾ "اور نہیں پہنچ پاتے اس مقام اور مرتبے کو مگر وہی جو بڑے نصیب والے ہیں"۔ جن کا نصیبہ بڑا یاور ہے، جو بخت آور ہیں۔ یہی وہ مقام ہے اور یہی وہ الفاظ ہیں جن کے حوالے سے میں نے عرض کیا تھا کہ اس مقام کو اگر "حَظٍّ عظیم" سے تعبیر کیا جائے تو نہایت بہتر ہو گا۔ کیونکہ یہ خود ان الفاظ کا ایک تقاضا ہے۔ اور اگر دوسرے مقامات کے ساتھ ربط و تعلق کے حوالے سے اسے "مرتبہ ولایت" سے تعبیر کیا جائے تو بھی یقیناً درست ہے۔

مومن کے لئے انتباہ

اب اس درس کی آخری آیت پر توجہ کیجئے ﴿وَاِمَّا يَنْزَغَنَّكَ مِنَ الشَّيْطٰنِ نَزْغٌ فَاسْتَعِذْ بِاللّٰهِ ۭ اِنَّهٗ هُوَ السَّمِيْعُ الْعَلِيْمُ ○﴾ یہاں متوقع سنگین خطرے سے آگاہ کیا جا رہا ہے کہ اس اعلیٰ مقام پر پہنچ کر بھی یہ نہ سمجھنا چاہئے کہ آدمی شیطان سے بالکل مامون و محفوظ ہو گیا ہے اور وہ اب کبھی آدمی کے اندر کوئی اشتعال پیدا نہ کر سکے گا، بلکہ شیطان سے اب بھی سابقہ پڑ سکتا ہے۔ ہو سکتا ہے کوئی چُوک اسے شیطان کی طرف سے لاحق ہو ہی جائے اور کبھی اس کے اندرونی جذبات اشتعال میں آ جائیں۔ یعنی انسان جب تک اس کشمکش خیر و شر میں مبتلا ہے وہ شیطان سے محفوظ و مامون نہیں ہے۔ بظاہر یہ بات اگرچہ نبی اکرم ﷺ سے مخاطب ہو کر کہی جا رہی ہے لیکن درحقیقت اصل مخاطب آپ کے جاں نثاروں سے ہے۔ آپؐ کے نقش قدم پر چلنے والے آپؐ کے وہ امتی جو اس دعوت الی اللہ اور دعوت الی الخیر کی ذمہ داریوں کو قبول کریں ان کو ہدایت دی جا رہی ہے کہ "وَاِمَّا يَنْزَغَنَّكَ مِنَ الشَّيْطٰنِ نَزْغٌ" اگر کبھی شیطان کی طرف سے کوئی چوک لگ ہی جائے، کہیں جذبات میں اشتعال اور غصہ آ ہی جائے تو تم فوراً بھانپ لو کہ درحقیقت یہ شیطان کی جانب سے ایک چوک ہے۔ اب اس کا علاج اور

تدارک یہ ہے کہ "فَاسْتَعِذْ بِاللّٰہِ" تو فوراً اللہ کی پناہ مانگ کر اس کی پناہ میں آجاؤ۔
"اِنَّهٗ هُوَ السَّمِیْعُ الْعَلِیْمُ O" "وہ سب کچھ سننے والا سب کچھ جاننے والا ہے"۔
وہ ہر دعا کو سنتا اور ہر اس صورتحال سے واقفیت رکھتا ہے جس میں وہ دعا کسی کی زبان پر آ
رہی ہے۔ کسی پیچیدہ صورتحال میں گرفتار ہو کر اگر کبھی انسان سے خطا اور لغزش سرزد ہو
جائے تو وہ بخوبی جانتا ہے کہ اس خطا کا صدور کس بیچارگی کی حالت میں ہوا ہے۔

سیرتِ رسولؐ سے رہنمائی

نبی اکرم ﷺ کا بھی ایک نقشہ ہمارے سامنے آتا ہے جو کہ یوم طائف سے متعلق
ہے۔ ایک مرتبہ حضرت عائشہ نے حضور ﷺ سے یومِ اُحد کے حوالے سے سوال کیا کہ
کیا آپ پر یوم احد سے سخت دن بھی کوئی گزرا ہے؟ آپؐ نے فرمایا: "ہاں طائف کا دن
مجھ پر کہیں زیادہ سخت تھا"۔ اس دن معاملہ یہ سامنے آتا ہے کہ طائف کی گلیوں میں آپؐ
کا جسم مبارک لہولہان ہوا، اوباش اور بدمعاش لوگوں نے آپ پر پتھراؤ کیا، فقرے
چست کئے گئے، آپ کا مذاق اڑایا گیا اور بالکل وہ صورت ہو گئی کہ جو ہمارے ہاں کبھی
گلیوں میں کسی دیوانے کے ساتھ ہوتی ہے کہ بچے تالیاں پیٹتے ہوئے اور کنکریاں مارتے
ہوئے اس کے گرد جمع ہو جاتے ہیں۔ بعینہٖ یہ نقشہ تھا محبوبِ ربّ العالمین اور سیّد الاولین
والآخرین ﷺ کا۔ ایک دفعہ آپ زیادہ خون بہہ جانے کی وجہ سے نقاہت کے باعث
بیٹھ گئے تو دو اوباش آدمی آگے آئے، ایک نے ایک طرف بغل میں ہاتھ ڈالا اور
دوسرے نے دوسری طرف اور اٹھا کر کھڑا کر دیا کہ چلو۔ اس قدر تکلیف دہ صورتحال
سے رسولِ رحمت ﷺ کو طائف کی گلیوں میں سابقہ پڑا ہے، لیکن جب آپ وہاں سے
واپس آئے تو آپ نے انتہائی دلدوز اور جگر کو چیر دینے والی دعا مانگی:

((اَللّٰهُمَّ اِلَیْکَ اَشْکُوْ ضُعْفَ قُوَّتِیْ وَقِلَّةَ حِیْلَتِیْ
وَهَوَانِیْ عَلَی النَّاسِ))

"اے اللہ میں تیری ہی جناب میں اپنی قوت کی کمی اور وسائل کی کمی اور لوگوں میں
اپنی ذلت و رسوائی کا شکوہ لے کر آیا ہوں"۔

اس وقت مَلِک الجبال حاضر ہوا اور کہا : اللہ تعالیٰ نے مجھے بھیجا ہے اور اگر آپ فرمائیں تو میں ان دونوں پہاڑوں کو آپس میں ٹکرادوں جن کے مابین طائف کی یہ بستی آباد ہے، اور یہ لوگ جنہوں نے آپ کو ستایا ہے پس کر سرمہ بن جائیں۔ لیکن رسولِ رحمت ﷺ کی رحمتہٌ للعالمینی پر قربان جایئے کہ فرمایا : نہیں، کیا عجب کہ اللہ تعالیٰ ان کی آئندہ نسلوں کو ہدایت کی توفیق عطا فرمادے۔ ایک نقشہ یہ ہے۔ لیکن ایک نقشہ وہ بھی ہے جو میدانِ اُحد میں سامنے آتا ہے کہ جب آپؐ پر غشی طاری ہوئی، آپ کے خود پر وہ تلوار پڑی کہ خود کو چیرتے ہوئے آپ کی پیشانی کی ہڈی میں سے گزر گئی اور اس نے آپؐ کے دو دانت بھی شہید کر دیئے۔ اس وقت نبی اکرم ﷺ کی زبان مبارک سے ایسے الفاظ نکل گئے کہ "اللہ اس قوم کو کیسے ہدایت دے گا جس نے اپنے نبیؐ کے چہرے کو خون سے رنگ دیا" تو فوراً وحی الٰہی نازل ہوئی اور فرمایا : "لَيْسَ لَكَ مِنَ الْاَمْرِ شَيْءٌ اَوْ يَتُوْبَ عَلَيْهِمْ اَوْ يُعَذِّبَهُمْ" (اے نبیؐ) آپ کے ہاتھ میں کوئی اختیار نہیں، اختیارِ مطلق اللہ کے ہاتھ میں ہے، وہ چاہے گا تو ان کو عذاب دے گا اور چاہے گا تو اپنی نظر کرم ان کی طرف پھیر دے گا اور انہیں ہدایت اور ایمان لانے کی توفیق عطا فرمادے گا۔

اس واقعہ میں ایک رہنمائی یہ ہے کہ ہو سکتا ہے کہ بڑے سے بڑے انسان سے بھی کسی وقت کوئی ایسا جملہ نکل جائے جو اس کے مقام اعلیٰ کے شایان شان نہ ہو۔ اس لئے یہ تعلیم فرمائی کہ "وَاِمَّا يَنْزَغَنَّكَ مِنَ الشَّيْطٰنِ نَزْغٌ فَاسْتَعِذْ بِاللّٰهِ" یعنی "اگر کبھی شیطان کی طرف سے تمہیں کوئی چوک لگ ہی جائے تو فوراً اللہ کی پناہ طلب کرو"۔ اور "اِنَّهٗ هُوَ السَّمِيْعُ الْعَلِيْمُ" میں ایک امید دلادی گئی کہ "اللہ تعالیٰ سب کچھ سننے والا، سب کچھ جاننے والا ہے"۔ وہ درگزر فرمانے والا بھی ہے۔ اگر کسی وقت جذبات کی شدت میں ایسا کوئی جملہ زبان سے نکل بھی جائے تو اللہ تعالیٰ معاف فرما دینے والا اور رحم فرمانے والا ہے۔ دعا ہے کہ اللہ تعالیٰ ہمیں اس مقام بلند تک پہنچنے کی ایک سچی آرزو دل میں پالنے کی توفیق عطا فرمائے۔ آمین!

وآخر دعوانا ان الحمد للّٰہ رب العالمین ○○

مرکزی **انجمن خدّام القرآن** لاهور

کے قیام کا مقصد

منبع ایمان ـــــ اور ـــــ سرچشمۂ یقین

قرآنِ حکیم

کے **علم و حکمت** کی

وسیع پیمانے ـــــ اور ـــــ اعلیٰ علمی سطح

پر تشہیر و اشاعت ہے

تاکہ اُمتِ مسلمہ کے فہیم عناصر میں **تجدیدِ ایمان** کی ایک عمومی تحریک برپا ہو جائے

اور اس طرح

اسلام کی نشاۃِ ثانیہ ـ اور ـ غلبۂ دینِ حق کے دورِ ثانی

کی راہ ہموار ہو سکے

وَمَا النَّصْرُ اِلَّا مِنْ عِنْدِ اللّٰہِ